توحید اور شرک



سیّد احمد سعید کاظمی قدس سرہٗ العزیز

ادارۂ معارفِ نعمانیہ لاہور

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ
نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

خُدا کی وَحدانیّت

اللہ تعالیٰ کی ذات ایک ہے۔ اس کا موجُود ہونا اور ایک ہونا ایسا ہے کہ جاہلیّت زدہ لوگوں کو اس کی تفصیل کی ضرورت ہو تو ہو ورنہ اس دَور میں سلیم الفطرت انسان کے لیے محض اس مسئلہ کی طرف توجہ دلانا ہی کافی ہے۔

عربی کا مشہور مقولہ ہے "اَلۡاَشۡیَاءُ تُعۡرَفُ بِاَضۡدَادِھَا" ہر چیز اپنی ضِد کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے۔ مثلاً راحت کا ادراک وہی کر سکتا ہے جو کبھی پریشان ہوا ہو۔ جس نے کبھی رنج وغم نہ پایا ہو وہ راحت کی لذت سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ دن کا اندازہ رات کے بغیر نہیں لگایا جا سکتا۔ اسی طرح ظُلمت کے بغیر نُور کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا اور یہی وجہ ہے کہ باطل کا تصوّر اگر کسی کے سامنے نہ ہو تو وہ حق کی لذّتوں سے آشنا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جو یہ نہ سمجھے کہ شرک کِسے کہتے ہیں وہ توحید کو نہیں جان سکتا۔ جس طرح حق کی پہچان باطل کے تصوّر سے ہوتی ہے اسی طرح یقیناً توحید کا صحیح ادراک بھی تب ہو گا جب ہم سمجھیں کہ شرک کِسے کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے توحید اور شرک کے حالات کو واضح طور پر بیان کیا اور لادینی کے تمام تصوّرات کو مٹا دیا۔ لیکن تعجب ہے کہ قرآن کریم کی تصریحات کے باوجُود بھی مسلمانوں میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ لیکن یہ چیز اُلجھی ہوئی ان ہی لوگوں کے لیے ہے

جن کے ذہن اُلجھے ہُوئے ہیں۔

توحید کا معنیٰ

توحید کا معنیٰ ہے اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کو اس کی ذات اور صفات میں شریک سے پاک ماننا۔ یعنی جیسا اللہ ہے ویسا ہم کسی کو اللہ نہ مانیں۔ اگر کوئی اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہُوئے کسی دُوسرے کو اللہ تصوّر کرتا ہے تو وہ ذات میں شِرک کرتا ہے۔

علم، سمع، بصر وغیرہ اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں اگر ان صفات میں کسی دوسرے کو برابر کا شریک ٹھہرائیں تو ہم مشرک ہوں گے۔

توحید اور شرک میں فرق

ہمیں توحید کا معنیٰ معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ ذاتِ پاک کے ساتھ ذات و صفات میں کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ "علم" اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اگر ہم کسی دُوسرے لیے علم ثابت کر دیں تو کیا شرک ہو گا؟ سمیع و بصیر اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ اگر ہم کسی دُوسرے کے لیے سُننے اور دیکھنے کی صفات ثابت کر دیں تو کیا یہ بھی شرک ہو گا؟ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے لیے صفت حیات ثابت ہے۔ اگر ہم کسی دُوسرے کو حیات کی صفت کا حامل کہیں تو کیا ہم مشرک ہوں گے؟

اللہ تعالیٰ کی حیات اور انسانی حیات

اللہ تعالیٰ کی حیات پر تو سب کا ایمان ہے اور جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے صفت حیات دی ہے وہ سب اس صفت کے حامل ہیں۔ پس ہم نے اپنے لیے بھی حیات کی صفت کو جانا اور اللہ تعالیٰ کے لیے بھی صفت حیات کو مانا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو حیات ہم اللہ تعالیٰ کے لیے مانتے ہیں وہ حیات نہ ہم اپنے لیے مانتے ہیں نہ کسی اور کے لیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ہمیں زندگی دینے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو کوئی حیات دینے والا نہیں۔ ہماری حیات عارضی ہے اس کی دی ہوئی ہے، محدود اور فانی ہے اللہ تعالےٰ کی حیات عارضی نہیں، عطائی نہیں اور محدود بھی نہیں۔ پس جب معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی حیات عارضی، عطائی اور محدود نہیں اور ہماری زندگی عطائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حیات باقی ہے اور ہماری فانی، تو شرک ختم ہو گیا۔ یہی تصورات تمام مسائل میں پیش کرتے چلے جائیے بات واضح ہو جاتی ہے۔

قُدرت خُداوندی اور اختیار انسانی

سوال ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر کوئی قوت پیدا نہیں کی؟ اگر نہیں کی تو پھر پتھر اور انسان میں کیا فرق ہوگا؟

اللہ تعالیٰ قادر و مختار ہے اور انسان کی وہ قدرت اور اختیار جو اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کے اندر پیدا کی، اس کی وجہ سے انسان بھی مختار ہوا کہ نہیں؟ پھر اللہ بھی مختار اور بندہ بھی مختار، یہ کیا ہوا؟ سُنیے! اللہ تعالیٰ مختار ہونے میں محتاج نہیں

اللہ تعالیٰ کو اختیار کسی سے عطا نہیں ہوا بلکہ ذاتی ہے اور بندہ مختار ہونے میں محتاج ہے۔

علم ایزدی اور علم انسانی

علم انسانیت کا زیور ہے لیکن علم تو خدا کی صفت ہے تو کیا یہ شرک ہو گا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو علم اللہ تعالیٰ کا ہے وہ بندے کا نہیں۔ اللہ تعالےٰ کا علم اپنا ہے، ہمارا علم اُسی کا عطا کردہ ہے۔

اسی طرح اللہ تعالیٰ سمیع وبصیر ہے اور فرماتا ہے کہ ہم نے انسان کو سمیع و بصیر یعنی سُننے اور دیکھنے والا بنایا۔ تو اللہ تعالیٰ کی یہ تمام صفات بے نیاز وغنی ہو کر ہیں اور بندوں کی یہ صفات اس کے حاجت مند اور نیاز مند ہو کر ہیں۔ کیونکہ انہیں یہ صفات ربّ نے دیں اور وہ خود اور اس کی صفات ربّ کے قبضہ اور قدرت میں ہیں۔ الوہیّت اور عبدیّت کے درمیان یہی فرق ہے۔

اَب شرک کا مطلب واضح ہو گیا کہ جو صفات اللہ تعالیٰ کی اپنی ہیں یعنی کسی کی عطا کردہ نہیں وہی کسی اور کے لیے ثابت کرنا شرک ہے۔ اور اُن صفات سے شرک لازم نہیں آتا جو اللہ تعالیٰ نے کسی کو بخشی ہیں۔ اگر انسانوں کو اللہ تعالےٰ نے صفات نہ بخشی ہوں تو پھر نہ کوئی سُننے والا ہو، نہ دیکھنے والا ہو، نہ زندہ ہو، نہ کوئی علم والا ہو، پس ہم یہی کہیں گے کہ جو صفات اللہ تعالیٰ کی ہیں وہ بندے کی نہیں ہوسکتیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات ازلی اور ابدی ہیں، بندے کی عارضی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے کمالات بغیر کسی کے پیدا کئے ہوئے ہیں اور انسان کے کمالات اللہ تعالےٰ کے بخشے ہوئے ہیں۔

اگر ہم کسی کے لیے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قدرت اور اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ اختیار مانیں، اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ سمع اور بصر مانیں تو شرک نہیں کیونکہ جب عطا کا تصوّر آیا تو شرک کی نفی ہو گئی۔

لیکن یہاں ایک سوال پیدا ہو گیا۔ آپ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی چیز کا تصوّر آ گیا تو شرک ختم ہو گیا حالانکہ یہ بات نہیں کیونکہ مشرکین بتوں کی پوجا کرتے تھے ان سے پُوچھا گیا کہ تم جو بُتوں کی پُوجا کرتے ہو تو اُن کو کس نے پیدا کیا؟ تو اللہ تعالےٰ فرماتا ہے "وہ کہیں گے اللہ نے پیدا کیا"۔ [1]

معلوم ہوا کہ صرف اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے کے تصوّر کو مان لینے سے مقصد پُورا نہ ہوا اور محض مخلوق کا تصوّر کرنا شرک سے بچنے کے لیے کافی نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ کی خاص صفات میں کسی کو بھی شریک نہ ٹھہرانا اور یہ ماننا کہ خُدا کی ہر صفت اللہ تعالےٰ کی خاص صفت ہے بھی ضروری ہے۔

مشرکین کا اعتقاد

یہ درست ہے کہ مشرکوں نے اپنے باطل معبودوں کو مخلوق مانا لیکن جب

---

[1] وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ فَاَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ سورۂ زخرف آیت ۸۷
(ترجمہ) اور اگر اے حبیب (صلی اللہ علیہ وسلم) تم ان سے پوچھو کہ انہیں کس نے پیدا کیا تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے پھر وہ کہاں اوندھے بہکے جاتے ہیں۔ علامہ محمود آلوسی نے تفسیر رُوح المعانی میں لکھا ہے کہ یہ آیت بتوں کی عبادت کرنے والے مشرکین کے متعلق بھی ہو سکتی ہے اور ان کے معبودوں کے متعلق بھی۔

مان لیا تو ان کو تسلیم کرنا چاہیئے تھا کہ مخلوق خالق کی محتاج ہے اور خالق کے وجُود کے بغیر مخلوق کا وجود نہیں ہو سکتا اور مخلوق جس طرح پیدائش میں خالق کی محتاج ہے اسی طرح موت کے لیے بھی اسی کی محتاج ہے۔ یہ اعتقاد ضروری تھا لیکن ان مشرکین نے کہا! یہ ٹھیک ہے کہ ان کو اللہ نے پیدا کیا لیکن پیدا کرنے کے بعد اُن کو الوہیت دے دی۔ لہٰذا اب اللہ تعالیٰ کوئی کام نہ کرے گا اور یہ کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اب ان کو اپنے حکم میں نہیں رکھا اور استقلال کی صفت ان کو دیدی کہ میرا حکم نہ بھی ہو تو تم کام کر سکتے ہو۔ یہ تھا ان جاہلوں کا اعتقاد۔ حالانکہ ان کو سمجھنا چاہیئے تھا کہ جو چیز مخلوق ہے وہ مستقل نہیں ہو سکتی۔

الوہیّت عطائی نہیں ہو سکتی

اللہ تعالیٰ سب کچھ دے سکتا ہے مگر الوہیت نہیں دے سکتا کیونکہ الوہیت مستقل ہے اور عطائی چیز مستقل نہیں ہو سکتی۔ الوہیت استقلال ہی کے معنیٰ میں ہے لیکن مشرکین کا تصور یہ تھا۔ انہوں نے کہا کہ لات و منات وغیرہ ایسے زاہد و عابد لوگ تھے کہ اللہ نے کہا تمہاری عبادت کمال کو پہنچ گئی۔ اَب میں تم پر یہ عنایت کرتا ہوں کہ تم آزاد ہو۔ میں تم پر نہ کچھ فرض کرتا ہوں اور نہ کوئی پابندی لگاتا ہوں۔ پس اس طرح انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے تمام معبودوں کو الوہیت دے دی۔

جس شخص کا یہ عقیدہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کو وصف الوہیّت عطا فرما دیا ہے وہ مشرک اور ملحد ہے۔ مشرکین اور مؤمنین کے مابین بُنیادی فرق یہی ہے کہ وہ غیر اللہ کے لیے عطائے الوہیّت کے قائل تھے اور مؤمنین کسی مقرب سے مقرب ترین

حتیٰ کہ حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں بھی الوہیت اور غنائے ذاتی کے قائل نہیں۔

ہر کام باذن اللہ عین توحید ہے

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗۤ اِلَّا بِاِذْنِہٖ" (پ۳)

(ترجمہ) کون ہے جو شفاعت کرے بغیر اذن خداوندی کے۔ ؎

پتہ چلا کہ بغیر اذن کے شفاعت کا اعتقاد شرک ہے اور اذن کے ساتھ عین توحید ہے۔ پس جب یہ عقیدہ آیا کہ فلاں شخص اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر کوئی حاجت پوری کر سکتا ہے تو شرک ہے اور جب اذن الٰہی کا عقیدہ آیا تو شرک ختم۔

؎ یہاں ایک قاعدہ بیان فرما دیا کہ ہر شخص کو بارگاہِ الٰہی میں لب کشائی اور شفاعت کی طاقت نہ ہوگی۔ صرف وہی شفاعت کرے گا جسکو پروردگار عالم نے اذن فرمایا۔ بتانا یہ ہے کہ اے کفار ومشرکین! قیامت کے دن تو وہی شفاعت کریگا جسے اجازت ہوگی اور تمہارے ان بتوں کو تو کوئی اجازت نہیں، پھر ان سے یہ توقع عبث کیوں لگائے بیٹھے ہو اور "الا باذنہ" سے یہ واضح فرما دیا کہ وہ محبوب ومقبول بندگانِ خدا ضرور شفاعت کریں گے جن کو ان کے رب نے اجازت مرحمت فرمائی ہوگی سب سے پہلے شفاعت کرنیوالے اللہ تعالیٰ کے محبوب حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے۔ بعد میں انبیاء کرام، اولیاء کرام، حفاظ اور شہداء بھی شفاعت کریں گے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا مُردوں کو زندہ کرنا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے جب قوم کے سامنے تعلیم رسالت پیش کی تو آپ نے کہا:
وَ اُبْرِئُ الْاَکْمَہَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ (پ۳ آل عمران آیت ۴۹)
(ترجمہ) "اور اچھا کرتا ہوں اندھے اور کوڑھی کو اور مُردے کو زندہ کرتا ہوں اللہ کے حکم سے۔"

اَب دیکھئے شفا دینا اور مُردے کو زندہ کرنا یہ اللہ تعالیٰ کا کام ہے۔ اس لحاظ سے تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے کاموں کا دعویٰ کیا۔ لیکن آپ آگے فرماتے ہیں "باذن اللہ" یعنی میں جو کچھ کرتا ہوں اللہ تعالیٰ کے اذن سے کرتا ہوں۔ پس جہاں اذن الٰہی آجائے تو شرک چلا جاتا ہے اور جہاں اذن گیا توحید بھی گئی۔ یہی اذن الٰہی ہونا اور نہ ہونا توحید اور شرک کا بنیادی نکتہ ہے۔

ایک شبہہ کا ازالہ

اگر آج کوئی یہ کہے کہ میں مادر زاد اندھوں کو اللہ کے اذن سے اچھا کر دُوں گا اور حالانکہ اسے اذن نہیں دیا گیا۔ تو اس کا یہ کہنا شرک تو نہ ہوگا کیونکہ اس نے خود اچھا کرنے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ باذن اللہ کہا۔ لیکن بغیر اذن کے اذن کہنا اللہ تعالیٰ پر بہتان باندھنا ہے۔ اور یہ خدا پر بہتان باندھنے والا جھوٹا کہلا سکتا ہے۔ اسے ہم کافر تو کہہ سکتے ہیں لیکن مشرک نہیں کہہ سکتے۔

اَب اگر کوئی اولیاء اللہ کو باذن اللہ حاجت روا کہے تو شرک تو ختم ہو گیا لیکن

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی اللہ تعالیٰ نے ان کو اذن دیا ہے؟ اگر اذن دیا تو اس کی کیا دلیل ہے؟

اس سوال میں مشرکین تو دونوں طرح سے پٹ گئے کہ ایک تو اللہ تعالیٰ کے اذن کے بغیر بُتوں کو حاجت روا مانا۔ دوسرا یہ کہ اگر وہ اذن کے ساتھ حاجت روا مانتے بھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اذن دیا نہ تھا تو اس طرح بھی پِٹ گئے۔ ایک تو یہ کہ وہ حاجت روائی کے اہل نہ تھے اور ان کو حاجت روا مانا۔ دوسرا یہ کہ اذن الٰہی کا محتاج بھی نہ مانا۔ پس وہ کفر میں بھی مبتلا ہوئے اور شرک میں بھی۔

اَب آئیے مومنین کی طرف کہ وہ شرک سے پاک ہیں کہ ان کے پاس باذن اللہ کا ثبوت ہے اور وہ باذن اللہ حاجت روا مانتے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعی اللہ نے ان کو اذن دیا ہے؟ اب خطرہ یہ ہے کہ ان پر کفر ثابت نہ ہو جائے۔ کیونکہ کفر بھی تو مصیبت ہے۔ ہم نے یہ بتانا ہے کہ ہمارے اعتقاد میں نہ شرک کا شائبہ ہے اور نہ ہی کفر کا۔

لیکن اس سے پہلے ایک بنیادی بات کہہ دوں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو شرفِ انسانیت عطا فرمایا ہے اس کے متعلق چند چیزیں قرآن وحدیث کی روشنی میں سامنے لائیں تو بات بالکل واضح ہو جائے گی۔

مقصدِ تخلیقِ انسان

اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کو کسی نہ کسی کام کے لیے پیدا کیا ہے۔ سورج اپنا کام کرتا ہے، درخت اپنا کام کرتے ہیں، پانی، ہوا اپنا کام کر رہے ہیں۔ اللہ تعالےٰ نے

انسانوں کو پیدا کیا اس کا بھی تو کوئی ہوگا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کے متعلق فرمایا:

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ (پ ۲۷)

(ترجمہ) "ہم نے جنوں اور انسانوں کو عبادت کے لیے ہی پیدا کیا۔"

عبادت تب ہوتی ہے جب معرفت ہو۔ پس اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اپنی معرفت کے لیے پیدا کیا۔ اب خدا کی معرفت کا مفاد کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کو کوئی جس قدر پہچانتا جائے گا یعنی جتنی معرفت ہوتی جائے گی اسی قدر اللہ کا قرب اس کے نزدیک بڑھتا جائے گا۔ معلوم ہوا کہ انسان کا مقصد حیات خدا کی معرفت ہے اور معرفت کا نتیجہ قرب ہے۔ تو یوں کہیے کہ قربِ الٰہی انسانیت کا کمال ہوا۔ اب اس کمال کو ذرا تفصیل کی روشنی میں دیکھیں تو تمام مسائل حل ہو جائیں۔ آیئے اس قرب کے مفہوم، قرب کے انجام اور قرب کے معنیٰ کو دلائل شرعیہ میں تلاش کریں۔

حدیث قدسی

"عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی قَالَ مَنْ عَادٰی لِیْ وَلِیًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ وَمَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ فَکُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِهٖ وَبَصَرَهُ الَّذِیْ یُبْصِرُ بِهٖ وَیَدَهُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِهَا وَاِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّهٗ وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِیْ لَاُعِیْذَنَّهٗ۔" [1]

[1] بخاری شریف جلد ۲ صـ۹۶۳ مطبوعہ مجتبائی، مشکوٰۃ جلد ا کتاب الدعوات مطبوعہ مجیدی کانپوری

اللہ تعالیٰ نے (اپنے رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان اقدس پر) فرمایا
کہ جس نے میرے ولی سے عداوت کی میرا اس سے اعلانِ جنگ ہے
اور جن چیزوں کے ذریعے بندہ مجھ سے نزدیک ہوتا ہے۔ ان میں
سب سے زیادہ محبوب چیز میرے نزدیک فرائض ہیں اور میرا بندہ
نوافل کے ذریعہ میری طرف ہمیشہ نزدیکی حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک
کہ میں اُسے اپنا محبوب بنالیتا ہوں تو جب میں اُسے اپنا محبُوب
بنالیتا ہوں تو میں اس کے کان ہوجاتا ہوں جس سے وہ سُنتا ہے اور
اس کی آنکھیں ہوجاتا ہوں جن سے وہ دیکھتا ہے اور اس کے ہاتھ
ہوجاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور میں اُس کے پاؤں بن جاتا ہوں
جن سے وہ چلتا ہے۔ اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتا ہے تو میں اُسے ضرور دیتا
ہوں اور اگر وہ مجھ سے پناہ مانگ کر کسی بُری چیز سے بچنا چاہے تو
میں اُسے ضرور بچاتا ہُوں"۔

بعض لوگ اس حدیث کا یہ معنیٰ بیان کرتے ہیں کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر کے اُس کا محبوب بن جاتا ہے تو پھر وہ اپنے کانوں سے کوئی ناجائز بات نہیں سُنتا، اپنی آنکھوں سے خلاف حکم شرع کوئی چیز نہیں دیکھتا۔ اپنے ہاتھ پاؤں سے خلاف شرع کوئی کام نہیں کرتا۔

یہ معنیٰ بالکل غلط ہے اور حدیث شریف میں تحریف کرنے کے مترادف ہے کیونکہ اس معنیٰ سے تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے نزدیکی حاصل کرنے والا بندہ محبوب ہونے کے بعد اپنے کسی عُضو یا حصّہ سے گناہ نہیں کرتا اور وہ اپنے کان،

آنکھ، ہاتھ اور پاؤں سے جو کام کرتا ہے وہ سب جائز اور شرع کے مطابق ہوتے ہیں۔ لیکن اس معنیٰ کو جب الفاظ حدیث پر پیش کیا جاتا ہے تو حدیث شریف کا کوئی لفظ اس کی تائید نہیں کرتا۔ کیونکہ ایک معمولی سمجھ والا انسان بھی اس بات کو آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ گناہوں سے بچنے کی وجہ سے تو وہ محبوب بنا۔ اگر گناہوں میں مبتلا ہونے کے باوجود بھی محبوبیت کا مقام حاصل ہو سکتا ہے تو تقویٰ اور پرہیزگاری کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ (پ ۳)

(ترجمہ) "آپ فرمایئے (انہیں کہ) اگر تم محبت کرتے ہو اللہ سے تو میری پیروی کرو (تب) محبت فرمانے لگے گا تم سے اللہ"۔

معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع یعنی تقویٰ اور پرہیزگاری کے بغیر مقام محبوبیتِ خداوندی کا حصول ناممکن ہے۔

بندہ پہلے برے کاموں کو چھوڑتا ہے، اُن سے توبہ کرتا ہے، فرائض و نوافل ادا کرتا ہے تب وہ محبوب ہو جاتا ہے۔ محبوب ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ اُس بندے کے کان ہو جاتا ہے جس سے پھر وہ سنتا ہے، اللہ اس کی آنکھ ہو جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے، اللہ اُس کے ہاتھ ہو جاتا ہے جس سے وہ پکڑتا ہے، اللہ اُس کے پاؤں ہو جاتا ہے جس سے وہ چلتا ہے۔ یہ سب محبوب بننے کے بعد ہوتا ہے۔ لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ برے کام بھی کرے اور محبوب بھی بن جائے اور بعد میں برے کام چھوڑے۔ [۱]

---

[۱] مولوی انور شاہ صاحب کشمیری صدر مدرس دار العلوم دیوبند نے بھی اپنی تصنیف فیض الباری شرح بخاری جزو چہارم صفحہ ۴۲۸ پر اس حدیث قدسی کے تحت یہی معنیٰ لکھے ہیں۔

تو بندہ جب اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کر لیتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی صفت سمع، بصر اور قدرت کے انوار بندے کی سمع، بصر اور قدرت میں ظاہر ہونے لگتے ہیں اور اس طرح یہ مقرب بندہ صفاتِ الٰہیہ کا مظہر بن جاتا ہے۔ یعنی یہ بندہ اللہ تعالیٰ کے نورِ سمع سے سنتا ہے، اسی کے نورِ بصر سے دیکھتا ہے اور اسی کے نورِ قدرت سے تصرّف کرتا ہے۔ نہ خُدا بندے میں حلول کرتا ہے نہ بندہ خدا ہو جاتا ہے بلکہ خُدا کا یہ مقرب بندہ مظہرِ خدا ہو کر کمالِ انسانیت کے اس مرتبہ پر فائز ہوتا ہے جس کے لیے اس کی تخلیق ہوئی تھی۔ اگر آپ غور فرمائیں گے تو آپ پر واضح ہو جائے گا کہ آیت کریمہ "وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنَ" کے معنی یہی ہیں جن کا مصداق یہ عبد مقرب ہے۔ عبادت کے معنی پامالی کے ہیں۔ عبد مقرب اپنی انانیّت اور صفاتِ بشریّت کو اپنے رب کی بارگاہ میں پامال یعنی ریاضت و مجاہدہ کے ذریعے ان کو فنا کر دیتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس بندے میں اس کی اپنی صفات عبدیت کی بجائے صفاتِ حق متجلّی ہوتی ہیں اور انوار صفات الٰہیہ سے وہ بندہ منور ہو جاتا ہے۔ جب قرآن سے ثابت ہے کہ درخت سے "اِنِّیْ اَنَا اللّٰہ" کی آواز آ سکتی ہے تو عبدِ مقرب کے لیے یہ کیونکر محال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفات سمع و بصر کا مظہر نہ ہو سکے۔

علامہ امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ اسی حدیث قدسی کی تشریح کرتے ہوئے

ارشاد فرماتے ہیں:

"وَكَذٰلِكَ الْعَبْدُ اِذَا وَاظَبَ عَلَى الطَّاعَاتِ بَلَغَ اِلَى الْمَقَامِ الَّذِیْ یَقُوْلُ اللّٰهُ كُنْتُ لَهٗ سَمْعًا وَّبَصَرًا فَاِذَا صَارَ نُوْرُ جَلَالِ اللّٰهِ سَمْعًا لَّهٗ سَمِعَ الْقَرِیْبَ وَالْبَعِیْدَ وَاِذَا صَارَ ذٰلِكَ النُّوْرُ بَصَرًا لَّهٗ رَاَى الْقَرِیْبَ وَالْبَعِیْدَ وَاِذَا صَارَ ذٰلِكَ النُّوْرُ یَدًا لَّهٗ قَدَرَ عَلَى التَّصَرُّفِ فِی الصَّعْبِ وَالسَّهْلِ وَالْبَعِیْدِ وَالْقَرِیْبِ اِنْتَهٰى" [1]

(ترجمہ) "اور اسی طرح جب کوئی بندہ نیکیوں پر ہمیشگی اختیار کر لیتا ہے تو اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے "كُنْتُ لَهٗ سَمْعًا وَّبَصَرًا" فرمایا ہے جب اللہ کے جلال کا نور اس کی سمع ہو جاتا ہے تو وہ دور و نزدیک کی آوازوں کو سن لیتا ہے اور جب یہی نور اس کی بصر ہو گیا تو وہ دور و نزدیک کی چیزوں کو دیکھ لیتا ہے اور جب یہی نورِ جلال اس کا ہاتھ ہو جائے تو یہ بندہ مشکل اور آسان، دور اور قریب چیزوں میں تصرف کرنے پر قادر ہو جاتا ہے"۔

حدیث قدسی کی شرح میں امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے مقرب بندہ کی شان میں جو کچھ لکھا ہے وہ عبد اور بشر سمجھتے ہوئے لکھا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ اس طرح ان صفاتِ عالیہ کا اس بندہ کے لیے ماننا اس کی عبدیت اور بشریت کے منافی نہیں۔

یہ انسانیت کا کمال ہے کہ بندہ صفاتِ خداوندی کا مظہر ہو جائے۔ جب اللہ تعالیٰ کی صفت سمع کی تجلّیاں اس کی سمع میں چمکنے لگیں گی تو یہ ہر قریب و بعید کی

---

[1] تفسیر کبیر سورۂ کہف ص۱۹ جلد ۲۱ (آیۃ اَمْ حَسِبْتَ اَنَّ اَصْحٰبَ الْكَهْفِ)

آواز کو سُن لے گا۔ یہ اس کی ذاتی صفت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تجلّی کا ظِل ہے، عکس ہے اور پرتو ہے۔ پرتو اور ظِل غیر مستقل ہوتا ہے اور پرتو والا مستقل ہوتا ہے۔ پس اصل توحید تو یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کا اتنا قرب حاصل کرے کہ خُدا کی صفات کا آئینہ بن جائے۔

امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی بصر کا نُور جب اس کی بصر کے صیقل شدہ آئینے میں چمکے گا تو وہ ہر نزدیک اور دُور کی چیز کو دیکھ لے گا۔

جب اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نُور کے جلوے اُس کے ہاتھ، پاؤں، دل اور دماغ میں ظاہر ہوں گے تو یہ ہر آسان ہر مشکل اور ہر دُور و نزدیک کی چیز پر قادر ہو جائے گا۔ اب بتائیے کہ جب مشکل بندے کی قدرت میں ہو گئی تو مشکل کشا نہیں تو اور کیا ہے؟

مگر خوب یاد رکھیے خُدا کا مشکل کشا ہونا ذاتی ہے اور بندے کا مشکل کُشا ہونا عطائی ہے کیونکہ بندہ اگر کسی کی کوئی مشکل حل کرتا ہے یا حاجت پُوری کرتا ہے تو اللہ کی دی ہوئی طاقت و اختیار سے کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے اِذن سے کرتا ہے۔

پس واضح ہو گیا کہ ہمارا یہ عقیدہ شرک کی تمام جڑوں کو کاٹنے والا ہے۔ اب بتائیے کہ عین توحید کو لوگ شرک کہتے ہیں تو اسلام پھر کیا ہو گا؟

پس یہ ادراک، علم، سمع، بصر جو اِن مقربینِ بارگاہِ الٰہی میں پائے جاتے ہیں اور جن میں دلیل موجود ہے۔ اِن میں آسان سے آسان کام پر بھی اولیاء اللہ کی قدرت ثابت ہو گئی اور مشکل و بعید چیزوں پر بھی ان کی قدرت ثابت ہو گئی اور یہ دلیل قائم ہو گئی کہ یہ نفع پہنچانے والے ہیں اور بارگاہ ربُّ العالمین میں دُعائیں کر کے ربّ کو

راضی کرنے کی صلاحیتیں رکھنے والے ہیں۔ ان میں مشکل کشائی کی قدرتیں بھی ہیں، دُور سے دیکھنے کی قدرتیں بھی ہیں اور بعید کی آواز کو بھی سُن سکتے ہیں۔

کفّارِ مکہ تو خدا پر یہ بہتان باندھتے تھے کہ خُدا نے ان پتھروں اور بتوں کو اختیار دے رکھا ہے اور اذن دے دیا ہے حالانکہ ایسا نہیں تھا اور جب ہم نے ان انبیاؑ و اولیاء پر اِذن کی شرط لگائی تو شرک دُور ہوگیا اور جب ان کے اختیار کو ثابت کر دیا تو کفر بھی جاتا رہا۔

الحمدللہ! ہم باذنِ اللہ کا اعتقاد کر کے شرک سے پاک اور انبیاء و اولیاء کے اختیارات ثابت کر کے کفر سے بھی پاک ہیں۔

بعض لوگوں کی یہ عادت ہے کہ جو آیاتِ قرآنی بتوں کے حق میں آئی ہیں ان کو مومنوں پر چسپاں کرتے ہیں اِس طرح بھولے بھالے مسلمانوں کو دھوکا دیتے ہیں۔

بخاری شریف میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما خارجی گروہ کو ساری مخلوق سے بُرا جانتے تھے اور فرمایا کہ ان لوگوں نے اپنا طریقہ یہ بنالیا ہے کہ جو آیات کفار و مشرکین کے حق میں نازل ہوئی ہیں ان کو مومنوں پر چسپاں کر دیتے ہیں۔[۱]

کسی محترم دوست نے ایک سوال پوچھا ہے کہ اس کے متعلق چند جملے عرض کر دوں تاکہ سابقہ مضمون نامکمل نہ رہے۔

سوال: ۔ کمال انسانیت کا جو معیار کتاب و سنّت کی روشنی میں ہمارے سامنے

---

[۱] وکان ابن عمر یراھم شرار خلق اللہ وقال انھم انطلقوا الی اٰیات نزلت فی الکفار فجعلوھا علی المؤمنین (بخاری شریف جلد دوم باب قتال الخوارج ص ۱۰۲۴)

آیا وہ ٹھیک ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کی صفات کا آئینہ اور مظہر تجلّیاتِ ربّانی بن جائے یہ بات زندگی میں تو ممکن ہے لیکن مرنے کے بعد تو وہ صرف مٹی کا ایک ڈھیر ہے۔ اُس وقت اس کے کمالات کا اعتراف کرنا کہاں مناسب ہے کہ مرنے کے بعد بھی وہ ابھی تک موردِ تجلّیاتِ الٰہی ہے اور ابھی تک انسانِ کامل ہے۔ مرنے کے بعد تو یہ بات ختم ہو جانی چاہیئے۔ اُن کا سُننا، دیکھنا، قریب اور بعید کی آواز سُننا، نزدیک دُور کی اشیاء کو دیکھنا اور اُن پر قُدرت رکھنا اور اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا مظہر قرار پانا ختم ہو جانا چاہیئے کیونکہ جب موت آئی تو تمام کمالات ختم ہو گئے

جواب : یہ بات ذہن میں اس لیے پیدا ہوئی کہ ہم نے انسانیت کے مفہوم کو نہ سمجھا۔ ہم نے خیال کیا کہ یہ گوشت اور پوست ہی انسان ہے۔

یہ غلط ہے، یاد رکھئے کہ یہ مفہومِ انسانیت، حقیقتِ انسانیت نہیں۔ حقیقت انسانیت وہ چیز ہے جو مرنے کے بعد بھی زندہ اور باقی رہتی ہے۔ یہ جسم اور رُوح جن کا مجموعہ ہمیں انسان نظر آتا ہے ان دونوں میں جو اصل حقیقت ہے وہ رُوح ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جسم تو گل سڑ جاتا ہے۔ اگر جسم کو اصل حقیقت قرار دے دیا جائے تو پھر یہ تو مرنے کے بعد فنا ہو جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ اصل حقیقت تو رُوح ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قبر جنّت کا باغ ہے یا جہنّم کا گڑھا ہے۔[1] وہ جنّت کا باغ اور دوزخ کا گڑھا کس کے لیے ہے؟ یقین کیجئے اسی رُوح کیلئے ہے۔ اجزائے جسمانی چاہے بکھرے ہُوئے ہوں یا اکٹھے ہوں ان کا تعلق رُوح سے اس طرح ہوتا ہے جیسے سورج کا تعلق اشیاء سے ہے۔ اگر کہیں ریت کا ڈھیر پڑا

---

[1] شرح الصدور ص ۶۳ (عربی)

ہو یا سنگلاخ زمین ہو یا گرد و غبار فضا میں ہو تو بھی سورج کی کرنوں کا تعلق اُس سے ہے ۔ اِسی طرح جسم کے اجزا پر رُوح کی شعاعیں پڑتی ہیں تو مرنے کے بعد بھی رُوح کا تعلق اس سالم بدن یا جسم کے متفرق اجزا سے ضرور ہو گا ۔ البتہ رُوح کا تعلق جو بدن سے اَب ہے وہ تعلق مرنے کے بعد اور روح کے بدن سے نکل جانے کے بعد بدل جائے گا ۔

پس اصل حقیقت رُوح ہے جو آفتاب کی حیثیت رکھتی ہے اور جسم فانی ہے ظاہر ہے کہ مرنے کے بعد پھٹ جائیگا، منتشر ہو جائیگا تو اس کا نظام بھی فانی ہے ۔ ایک مرتبہ کھانا کھایا پھر ضرورت ہو گئی ۔ جسم کا کمال بھی فانی ہے ۔ کئی طاقتور انسان پیدا ہوئے لیکن جب موت آئی تو ان کی اُنگلی بھی نہیں ہلتی ۔ لیکن روح باقی ہے تو اسکی صفات بھی باقی ہیں اور اس کے کمالات بھی باقی ہیں ۔

یہاں ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ رُوح بمنزلِ آفتاب کے ہے ۔ رُوح اگر خوش ہے تو جسم کے اجزا پر اچھے تاثرات دے گی اور اگر رُوح ناخوش ہے تو وہ اپنا بُرا اور ناخوش اثر دے گی ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قبر میں کوئی گرمی یا عذاب نہیں ہوتا اور نہ ہی کسی قبر میں کوئی باغ وغیرہ نظر آتا ہے ۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ رُوح اگر خوش ہے تو بدن پر خوشی کے اثرات وقف کرے گی اور اگر تکلیف میں ہے تو بدن پر تکلیف کے اثرات چھوڑ دے گی ۔ لیکن وہ خوشی یا تکلیف کے اثرات عالم برزخ میں ہوں گے اور کسی کو نظر نہیں آئیں گے ۔ مثلاً کسی کے ذہن میں غمی یا خوشی کے اثرات ہیں یا کسی کے سر میں درد ہے تو اس کے سر کے عالم کو آپ کس طرح جان سکیں گے ؟ درد والے سر پر آپ

ہاتھ رکھ دیں، یا لاکھ آلات لگائے جائیں تو کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ سر کے اندر درد ہے؟ ہلکا درد ہے یا تیز درد ہے۔ وہ تو اسی کو پتہ ہے جس کو درد ہے۔ اسی طرح قبر میں جو مُردہ یا مُردے کے اجزاء پڑے ہیں۔ یقیناً ان پر رُوح نے راحت یا رنج کے اثرات چھوڑے ہیں، مگر وہ ہمیں معلوم نہیں ہوتے۔ مُردے کی تکلیف کا اثر مُردے کے اجزا ہی کو محسوس ہوگا نہ کہ زمین کو جس پر وہ اجزاء پڑے ہیں۔

ایک شخص عالم خواب میں دیکھتا ہے کہ اس کے مکان کو آگ لگ گئی ہے اُس کی چارپائی جل رہی ہے، وہ خود جل رہا ہے، چیخ رہا ہے۔ آپ اس کو دیکھیں تو کیا آپ کو اُس کی چارپائی جلتی ہُوئی نظر آئے گی؟ یقیناً نہیں۔ تو اسی طرح عالمِ برزخ میں کافروں کو عذاب ہوتا ہے مگر ہمیں قبر کے اندر عذاب، گرمی اور آگ معلوم نہیں ہوتی۔

فشارِ قبر

حدیث شریف میں آیا ہے، مرنے کے بعد جب انسان کو قبر میں دفن کیا جاتا ہے تو قبر تنگ ہوجاتی ہے۔ مومن ہو اس کو بھی دباتی ہے اور کافر ہو اس کو بھی دباتی ہے۔ مومن کو قبر کیوں دباتی ہے؟ یہ اس لیے کہ قبر تو آغوشِ مادر ہے۔ قبر کی آغوش میں مُردہ ایسے ہے جیسے ماں کی گود میں بچّہ۔ اُمّ ماں کو کہتے ہیں اور اصل کو بھی کہتے ہیں، بچّے کی اصل ماں ہے۔ اسی طرح تمام بنی آدم کی اصل زمین ہے اور اصل ماں ہوتی ہے۔ پس ہم پیدا ہوئے اور اپنے احوال میں مبتلا ہو گئے اور یہ ایسا ہے کہ جیسے کوئی بچّہ پیدا ہوتا ہے اور آغوشِ مادر کا زمانہ ختم ہونے پر وہ بازار،

گلیوں میں جاتا ہے۔ اگر بچہ اچھا ہے اور ماں اس کی خصلتوں سے خوش ہے، اس صورت میں ماں منتظر رہے گی کہ کب میرا بچہ آئے میرے سینے سے لگے اور میرے دل کو ٹھنڈا کرے۔ لیکن ایک بچہ بُرا ہے اس صورت میں ماں اس سے جلی بیٹھی ہے اور چاہتی ہے کہ وہ آئے اور میں اس کو سزا دوں۔ اسی طرح قبر ہر بنی آدم کیلئے منتظر ہے۔

ماں جب بچہ کو آغوش میں دبا کر پیار کرتی ہے تو اس بچہ کو کچھ نہ کچھ تکلیف تو ضرور ہوتی ہے لیکن بچہ اس تکلیف کو تکلیف نہیں سمجھتا۔ پس قبر جب مومن کو دباتی ہے تو مومن کو وہ تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔

معلوم ہوا کہ اگر رُوح کو فانی قرار دیں تو یوں سمجھئے کہ قبر کا عذاب اور ثواب سب کچھ ختم اور حساب و کتاب بھی نہ ہوا اور پھر حشر و نشر کیسا؟ کیوں کہ ثواب و عذاب تو روح کے لیے ہے۔ اگر رُوح کو فانی مان لیں تو سارا دین ختم ہو کر رہ جائے۔

ہم نے ثابت کر دیا کہ رُوح باقی ہے اور جب رُوح باقی ہے تو حقیقتِ انسانیت اسی رُوح کا نام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دو چیزیں دیں، جسم اور رُوح، ان میں جسم فانی ہے اور رُوح باقی ہے پس فانی کے اثرات اور وصف بھی فانی۔ کیونکہ موصوف فانی ہو تو اس کی صفات بھی فانی ہوتی ہیں۔ لہذا بدن فانی تو بدن کے سب کمالات بھی فانی ہیں۔

اب بتایئے کہ منظہرِ تجلیاتِ صفاتِ الٰہی اور آئینہ جمالِ رب ہونا یہ صفت رُوح کی ہے یا جسم کی؟ یقیناً یہ رُوح کی صفت ہے تو معلوم ہوا کہ موصوف جب باقی ہے تو اس کی صفت بھی باقی ہو گی۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ نیکی کے کام ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی عبادت اور اللہ کا ذکر ہے۔ یہ رُوح کی غذا ہے۔ تو کیا مرنے کے بعد ایمان،

نماز اور دوسری نیکیاں ختم ہوجائیں گی یا باقی رہیں گی ؟ یقیناً باقی رہیں گی۔ تو بھائی مرنے کے بعد تمہاری تمام روحانی صفتیں باقی رہیں اور ولی کے مرنے کے بعد اس کے تمام روحانی کمالات ختم ہوجائیں یہ عجیب بات ہے۔ پس ان حضرات کی قبور کے اندر بھی روحانیت زندہ ہوتی ہے اور روحانی کمالات بھی باقی ہوتے ہیں۔

ترمذی شریف کی حدیث ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ ایک صحابیٔ رسول نے ایک قبر پر اپنا خیمہ نصب کیا لیکن اس کو اس جگہ قبر ہونے کا علم نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں کسی انسان کی قبر ہے اور اس میں سے سورۂ ملک (پ ۲۹) پڑھنے کی آواز آرہی ہے۔ جب وہ صحابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو تمام واقعہ بیان کیا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا سورہ ملک روکنے والی اور نجات دینے والی ہے اپنے پڑھنے والے کو عذابِ قبر سے۔

اگر مرنے کے بعد قبر میں کوئی چیز باقی نہ ہوتی تو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُس صحابی سے فرماتے کہ بھئی یہ تمہارا وہم ہے یا فرماتے کہ کوئی فرشتہ ہوگا یا کوئی جن تلاوت کر رہا ہوگا۔ قبر میں مرنے کے بعد کچھ نہیں ہوتا۔ لیکن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا نہیں فرمایا اور کوئی تردید نہیں فرمائی۔

یہ تو عہدِ رسالت کا واقعہ ہے اب دورِ صحابہ کا واقعہ سُنیئے۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے دَور میں مکہ اور مدینہ کے درمیان نہر کھودی گئی تو اتفاقاً وہ نہر اسی راستے سے آئی جس میں اُحد کا قبرستان آتا تھا۔ مزدور کام کر رہے تھے۔ ایک مزدور نے کھدائی کرتے ہوئے زمین میں پھاوڑا مارا تو اتفاقاً وہیں ایک شہید دفن تھا تو وہ پھاوڑا اس کے پاؤں کے انگوٹھے میں جا لگا اور خون جاری

ہوگیا۔[1] یہ تو قبر میں حیاتِ جسمانی کی دلیل ہے کہ مرنے کے بعد ان کے جسم میں بھی زندگی موجود ہے اور چہ جائیکہ رُوح جو ہے ہی باقی۔

زمانہ تابعین کا ایک واقعہ

امام ابونُعَیم "حلیۃ الاولیاء" میں حضرت سعید بن جُبَیرؒ سے روایت نقل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کی قسم! میں نے اور حمید طویل رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت ثابت[2] بنانی رضی اللہ عنہ کو لحد میں اُتارا تھا۔ جب ہم کچی اینٹیں برابر کر چکے تو ایک اینٹ گر گئی۔ میں نے انہیں دیکھا کہ وہ قبر میں نماز پڑھ رہے ہیں۔ وہ دُعا کیا کرتے تھے۔ اے اللہ اگر تو نے کسی مخلوق کو قبر میں نماز پڑھنے کی اجازت دی ہے تو مجھے بھی اجازت فرما۔ اللہ تعالیٰ کی شان سے بعید تھا کہ اللہ تعالیٰ ان کی دُعا کو رد فرما دے۔[3]

امام بیہقیؒ شعب الایمان میں اپنی سند سے قاضی نیشاپور ابراہیم سے روایت

---

[1] جذب القلوب، شیخ عبدالحق محدث دہلوی صہ ۲۰۲ مطبوعہ کراچی

شرح الصدور، امام جلال الدین سیوطی صہ ۲۹۹ مطبوعہ کراچی

[2] ثابت بن اسلم بنانی بصری، تابعی ہیں۔ انہوں نے حضرت انس اور دیگر صحابہ سے روایت کی ہے۔ یہ چالیس سال حضرت انس کی صحبت میں رہے۔ شعبہ کہتے ہیں کہ ایک دن اور ایک رات میں قرآن ختم کیا کرتے تھے اور صائم الدہر تھے۔ ابوبکر المزنی کہتے ہیں کہ ہم نے اس سے زیادہ عابد کسی کو نہیں پایا۔ ان کی وفات ۱۲۳ھ میں ہوئی۔

[3] کشف النور عربی، علامہ عبدالغنی نابلسی رحمۃ اللہ علیہ صہ ۹ مطبوعہ لاہور

کرتے ہیں کہ ایک صالح عورت کا انتقال ہو گیا۔ ایک کفن چور اس کے جنازہ کی نماز میں اس غرض سے شامل ہو گیا تاکہ ساتھ جاکر اس کی قبر کا پتہ لگائے۔ جب رات ہو گئی تو وہ قبرستان میں گیا اور اس عورت کی قبر کھود کر کفن کو ہاتھ ڈالا تو وہ خدا کی بندی بول اُٹھی کہ سبحان اللہ! ایک جنتی شخص ایک جنتی عورت کا کفن چُراتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے میری اور ان تمام لوگوں کی مغفرت فرمادی جنہوں نے میرے جنازے کی نماز پڑھی اور تُو بھی اُن میں شریک تھا۔ یہ سُن کر اُس نے فوراً قبر پر مٹی ڈال دی اور سچے دل سے تائب ہو گیا۔[1]

پس ولیوں کا تو یہ حال ہے کہ چور جائے اور ولی بن کر آئے۔ اب کوئی کہے کہ مرنے کے بعد اُن کی کوئی روحانی طاقت نہیں تو یہ سراسر غلط ہے کیونکہ رُوح تو اپنے لوازمات کے ساتھ باقی ہے۔

حدیث قدسی میں ہے کہ میرا بندہ جب میرا مقرب ہوا تو اُس نے اپنے کلام کو میرے کلام کا اور اپنی صفات کو میری صفات کا آئینہ دار بنا دیا تو اب مجھ سے کچھ مانگے تو میں اس کو عطا کروں گا، وہ مجھ سے پناہ مانگے تو میں اسے پناہ دوں گا۔ یہ سب کمالات اس کی روح کے لیے ہیں اور جب تک رُوح چلے گی یہ سب باتیں بھی ساتھ چلیں گی۔ اس حدیث میں وقت کی کوئی قید نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب مانگے میں ضرور دوں گا۔ تو اب وہ چاہے دُنیا میں مانگیں یا موت کے بعد کے جہان میں مانگیں یا آخرت میں مانگیں، وہ مانگ سکتے ہیں اور خُدا ضرور دیتا ہے۔

---

[1] شرح الصدور، علامہ سیوطی (متوفی ۹۱۱ھ) مطبوعہ کراچی ص ۲۰۵

ہم اولیاء اللہ کے مزارات پر اس لیے جاتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ (اِنْ سَاَلَنِیْ لَاُعْطِیَنَّہٗ) اگر وہ مجھ سے کچھ مانگتے ہیں تو میں ان کو ضرور دیتا ہوں۔ تو کسی کے مزار پر جا کر یہ کہنا کہ اے اللہ کے ولی خدا سے دُعا کریں کہ میرا فلاں کام ہو جائے تو کوئی قباحت نہیں۔ اب اگر کوئی کہے کہ ولی کے پاس جانے سے کچھ نہیں بنتا تو اُس نے ولی کا کچھ نہ بگاڑا بلکہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ کو جھٹلایا۔

اب بات یہ ہے کہ کسی نے مزار پر جا کر کہا کہ اے اللہ کے ولی باذن اللہ ہمارا یہ کام کردو، وہ کام نہ ہوا تو اولیاء اللہ کو بُرا کہنے لگے۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ تو کسی اذن کا محتاج نہیں۔ وہ فرماتا ہے:۔

"میرے بندو مجھ سے دُعا مانگو میں قبول کروں گا"۔ (پ ۲۴)

اب دیکھئے ایک شخص کو پھانسی کا حکم ہوگیا۔ اِدھر تم دُعا مانگتے ہو کہ اے اللہ اس کو پھانسی سے بچالے۔ لیکن جب خُدا نے تقدیر مبرم میں لکھ دیا تو وہ ضرور پھانسی چڑھے گا اب خُدا کا کچھ بگاڑ کر دکھاؤ۔ وہ تو کہتا ہے تم مجھ سے دُعا مانگو میں قبول کروں گا۔ اب یہاں تم خدا کا کچھ بگاڑ نہیں سکتے تو اولیاء اللہ کا کیا بگاڑو گے وہ تو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے سوا چلتے ہی نہیں۔"

جب زندہ لوگوں میں سے اہلِ خیر اور صالحین سے دُعا کی درخواست جائز ہے۔ پھر جب یہ حضرات جن سے زندگی میں طلب دُعا کرتے تھے وصال فرما جائیں اور برزخی حیات سے مشرف ہو جائیں تو اُن سے اب طلبِ دُعا میں کیا قباحت پیدا ہو جاتی ہے ان کی بزرگی، ان کا تقرب اور ان کی مبارک روحانیت پر تو موت نہیں آئی، موت تو صرف جسم پر ہے نہ کہ رُوح پر، وہ تو زندہ ہے، اس کا شعور و ادراک، قوت

سماعت اور استجابت دُعا بھی باقی ہے بلکہ ساری کرامتیں باقی ہیں کیونکہ یہ اسکے روحانی کمالات ہیں اور رُوح فانی نہیں۔ اس لیے یہ کمالات بھی فانی نہیں۔

یہ تو تھی عالم دُنیا اور عالم برزخ کی بات۔ اب سوال یہ ہے کہ کیا عالمِ آخرت میں بھی اولیائے کرام کا فائدہ ہوگا یا نہیں؟ تو میں عرض کرتا ہوں کہ آخرت میں بھی ان بزرگوں سے فائدہ ہوگا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! میری امت کے علماء حفاظ اور شہدا شفاعت کریں گے۔ حتیٰ کہ ایک بچّہ بھی جس کے والدین مومن ہوں وہ ان کے لیے سفارش کرے گا۔

اگر انبیاء اور اولیاء سے مدد مانگنا شرک ہے تو یہ شرک آخرت تک چلے گا۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ اب تو شرک ہے لیکن آخرت میں عین توحید ہو جائے۔ کیونکہ شرک تو ہر زمانہ میں شرک ہی رہے گا۔ آخرت میں بھی کوئی غیر اللہ سے مدد مانگے تو شرک ہی ہوگا تو جناب یہ شرک تو قیامت تک چلے گا۔ کیونکہ ہولِ محشر سے بڑھ کر تو کوئی قیامت نہیں ہوگی اور اس وقت تمام لوگوں کی نظر کسی اللہ کے بندے کو تلاش کرنے میں ہوگی۔ سب آپس میں کہیں گے کہ کوئی ایسی ہستی ڈھونڈو جو تمہاری شفاعت کرے۔ سب لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی خدمت میں آئیں گے کہ آپ ابوالبشر آدم ہیں آپ ہماری شفاعت کریں۔ آدم علیہ السلام یہ نہیں فرمائیں گے کہ تم شرک کر رہے ہو، مجھ سے کیا مانگتے ہو، جاؤ خُدا کے پاس۔ نہیں بلکہ وہ بھی غیر کی راہ دکھائیں گے اور فرمائیں گے نفسی نفسی "اِذْهَبُوا اِلٰی غَیْرِیْ"۔

دیکھئے کہ جب غیر اللہ سے مدد مانگنا شرک ہے تو قیامت[1] کے دن جو لوگ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس جائیں گے، کیا وہ مشرک ہوں گے؟ یہاں تو پھر

---

[1] بخاری شریف

حضرت آدم علیہ السلام بھی نہیں بچتے وہ بھی اُن کو خدا کا راستہ نہ بتائیں گے بلکہ کسی غیر کا راستہ بتائیں گے اور فرمائیں گے "اِذۡهَبُوۡا اِلٰی غَیۡرِیۡ" پس تمہارے فتویٰ کی رُو سے تو (معاذاللہ) حضرت آدم علیہ السلام بھی مشرک ہُوئے اور ان کے پاس جانے والے بھی مشرک ہُوئے۔

تو جناب! آپ کے تمام فتوے غلط ہیں کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام تو مشرک ہو نہیں سکتے۔ پھر سب لوگ آدم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی راہنمائی سے حضرت نوح علیہ السلام کے پاس پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پاس پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پاس جائیں گے۔ ہر ایک یہی کہے گا "اِذۡهَبُوۡا اِلٰی غَیۡرِیۡ"۔

اَب ان کو خیال آئے گا کہ چلو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی بارگاہ میں چلیں۔ جب وہاں پہنچیں گے تو آپ کی بارگاہ میں بھی وہی مدعا عرض کریں گے جو دیگر انبیاء کرام کے حضور عرض کر چکے تھے۔ تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سماعت فرمانے کے بعد یہ نہیں فرمائیں گے کہ بھئی تم تو پکے مشرک ہو، فلاں فلاں نبی کے پاس گئے پھر میرے پاس آئے ہو، جاؤ خُدا کے پاس۔ نہیں نہیں ایسا نہیں فرمائیں گے۔ بلکہ ایسا فرمائیں گے کہ آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام نے نفسی نفسی "اِذۡهَبُوۡا اِلٰی غَیۡرِیۡ" اس لیے کہا تھا کہ تم مجھ تک پہنچ جاؤ اور اس کام کے لیے تو میں ہوں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھ ہی کو یہ اعزاز عطا فرمایا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کے نفسی نفسی کہنے میں حکمت یہ ہے کہ جب سردار موجود ہو تو سردار کے ہوتے ہوئے اس کا کام نیچے والے نہیں کریں گے۔ کمشنر موجود ہو تو کمشنر کا کام ڈپٹی کمشنر نہ کرے گا۔ پس مطلب یہ تھا کہ تم سب کے پاس گھوم آؤ جو کام کوئی

نہ کرے وہ میرا محبوب کرتا ہے۔ اور حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا " اَنَا لَهَا "
کہ اس کام کے لیے تو میں ہوں۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس وقت اللہ تعالیٰ کے دربار میں سر جھکا دیں گے۔ فَيُقَالُ يَا مُحَمَّدُ اِرْفَعْ رَأْسَكَ وَقُلْ تُسْمَعْ وَسَلْ تُعْطَهْ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ حکم دیا جائے گا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سر اُٹھاؤ اور کہو آپ کی بات کی شنوائی ہو گی اور جو مانگو عطا ہو گا اور شفاعت فرمایئے آپ کی شفاعت قبول ہو گی۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اپنی امت کی شفاعت فرمائیں گے پھر انبیاؑ و اولیاء اور مومنین کو شفاعت کرنے کی اجازت مرحمت ہو جائے گی۔

دیکھئے اگر انبیاء و اولیاء کے پاس جانا اور اُن سے مدد مانگنا شرک ہے تو یہ شرک تو پھر آخر تک چلے گا۔ پس معلوم ہوا کہ جو یہاں شرک سمجھتے ہیں وہ وہاں بھی نہیں جائیں گے اور جو جائیں گے نہیں تو شفاعت کیسے پائیں گے؟ کرنے والا تو سب کچھ خُدا ہے مگر خداوند کریم اپنے بندوں کا احترام کرتا ہے اور اعزاز بخشتا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے ولی کچھ نہیں ہوتے، سب فراڈ ہے تو وہ بھی سُن لیں۔ حدیث قدسی کے شروع ہی میں ہے کہ " مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ اٰذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ " یعنی جس نے میرے ولی سے عداوت کی اس کے ساتھ میرا اعلانِ جنگ ہے۔

تو دوستو! اولیاء کرام نہ خدا کے شریک ہیں نہ ساجھی ہیں وہ تو خدا کے اذن اور حکم کے تابع ہیں معلوم ہوا " مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ " تو ایک تنکا بھی نہیں ہلا سکتا اور " بِاِذْنِ اللّٰهِ " سے مُردے بھی زندہ ہو جاتے ہیں۔ اب جو لوگ " مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ " کی باتیں " بِاِذْنِ اللّٰهِ " پر چسپاں کرتے ہیں خُدا اُن کو ہدایت دے۔

اب ایک بات میری نظر میں ایسی باقی ہے جو اہلِ علم طبقہ کے لیے قابلِ تشریح ہے۔ وہ یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے مقربین اور حضرات اولیاء کرام کے تصرفات بعد الوفات اور علم و ادراک بعد الممات کے قائل نہیں اور اس امر کو توحید کے منافی سمجھتے ہیں اُن کی طرف سے علی العموم یہ شبہ پیش کیا جاتا ہے اور اچھے خاصے پڑھے لکھے طبقہ کو متاثر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ آپ لوگ تو اولیاء اللہ کے علم و ادراک بعد الوفات کا عقیدہ رکھتے ہیں۔ حالانکہ قرآن پاک میں صاف وارد ہے کہ انبیاء کرام کو موت کے بعد کوئی ادراک اور کوئی علم نہیں ہوتا جو انبیاء نہیں بلکہ اولیا ہیں اُن کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کیونکر صحیح ہوگا۔

اس شبہ کو کہ مرنے کے بعد اولیاء اللہ بے خبر ہوتے ہیں قرآن مجید کی ایک آیت سے مؤید کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں اس آیت کا جواب دیتا ہوں تاکہ اس شبہ کا ازالہ ہوجائے۔ وہ آیت یہ ہے:

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ عَامٍ۔ (پ۳ سورہ بقرہ آیت ۲۵۹)

ترجمہ: "یا مثل اس شخص کے جو گزرا ایک بستی پر وہ اس حال میں تھی کہ گری پڑی تھی اپنی چھتوں کے بل، کہنے لگا کیونکر زندہ کرے گا اسے اللہ تعالیٰ اس کے ہلاک ہونے کے بعد، پس حالتِ موت میں رکھا اسے اللہ تعالیٰ نے سو سال تک، پھر زندہ کیا اُسے فرمایا کتنی مدت تو یہاں ٹھہرا رہا۔

اُس نے عرض کی میں ٹھہرا ہوں گا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ، اللہ نے فرمایا نہیں بلکہ ٹھہرا رہا ہے تو سَو سال"۔

اللہ تعالیٰ نے کچھ امثال بیان فرمائے۔ ایک یہ کہ حضرت عُزیر علیہ السلام جو ایک دراز گوش یا حمار شریف پر سوار ہو کر تشریف لے جا رہے تھے اور کسی ایسے مقام سے گزرے جہاں عمارتیں گر چکی تھیں اور اس بستی کے کھنڈرات پڑے تھے (مفسرین نے لکھا ہے کہ اس بستی سے مراد بیت المقدس ہے) جب آپ وہاں سے گزرے تو فرمانے لگے اے اللہ! تو ان کے مرنے کے بعد ان کو کس طرح زندہ فرمائے گا اور کس طرح اُٹھائے گا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کو سو سال تک حالت موت میں رکھا اور پھر ان کو اُٹھایا اور فرمایا تم یہاں کتنی دیر ٹھہرے رہے۔ انہوں نے جواب دیا میں تو ایک دن یا اس کا کچھ حصہ ٹھہرا رہا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا تم تو یہاں سو برس تک ٹھہرے رہے ہو۔

اللہ تعالیٰ نے ان کے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ ٹھہرے رہنے کے جواب میں بتایا اور ثابت کر دیا کہ اُن پر سَو برس تک موت طاری رہی۔ اب شبہ پیدا ہوا کہ اگر اُن کو معلوم ہوتا تو وہ سو برس کی بجائے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ کیوں کہتے؛ پس معلوم ہوا کہ مرنے کے بعد اُن کو کوئی علم و ادراک نہ رہا تھا۔

جس آسان طریقہ سے یہ شبہ بیان کیا جاتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسی آسان اور سہل طریقہ سے اس شبہ کو دُور کر دوں۔ تو سُنیئے

سب سے پہلے میں یہ عرض کروں گا کہ قرآن مجید میں حضرت عُزیر علیہ السلام کا ذکر نہیں آیا بلکہ فرمایا: "كَالَّذِىْ مَرَّ عَلٰى قَرْيَةٍ" (مثل اس شخص کے جو گزرا ایک بستی پر) یہاں "اَلَّذِىْ" کا لفظ آیا ہے اور "اَلَّذِىْ" کی تفسیر میں کئی قول آئے ہیں۔

جن میں سے کوئی قول ایسا نہیں جس پر قطعیت کا حکم لگایا جاسکے۔ (قطعیت سے مُراد یہ ہے کہ جس طرح قرآن کا انکار کفر ہے وہ بھی کفر ہو) "اَلَّذِیْ" سے مُراد اکثر مفسرین کے نزدیک عُزیر علیہ السلام ہیں۔ لیکن یہ قول محض مفسرین کا قول ہے۔ پس یہاں قطعیت کا حکم نہیں آسکتا۔ اس کے علاوہ تفاسیر میں چند اقوال ہیں جن میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ "اَلَّذِیْ" سے مُراد ایک کافر ہے (تفسیر بیضاوی)۔ لہٰذا اگر ہم اس سے مراد ایک کافر لیں تو اَب جہاں ایک قول کافر کے بارے میں آئے وہاں عُزیر علیہ السلام کو کیسے لائیں؟ کیونکہ ایسی بات سے قطعی طور پر کسی نبی کو متعیّن کرنا باطل ہے۔ لہٰذا تمہارا یہ قول قابلِ سماعت نہیں۔

اس کا دوسرا جواب یہ ہے کہ اگر "اَلَّذِیْ" سے مُراد عُزیر علیہ السلام ہیں اور مرنے کے بعد اُن کو کوئی علم نہیں تو یہ سوال پیدا ہوگا کہ جس کو کسی بات کا علم نہ ہو اس سے کسی علم کی بات کا دریافت کرنا کیسے صحیح ہے۔ جماد، پتھر اور مٹّی کے اندر تو کوئی علم نہیں ہوتا اور جب وہ (معاذ اللہ) مٹّی، پتھر ہیں تو کیا علم کی بات ان سے پوچھنا غلط نہیں۔ شاید آپ کہیں کہ خُدا کی شان یہ ہے کہ خُدا کوئی کام کرے تو خدا کے کام پر کوئی سوال نہیں کرسکتا کہ اللہ نے ایسا کیوں کیا۔

میں عرض کروں گا کہ اگر آیت کا مطلب یہ لے لیا جائے تو خدا تعالےٰ کے کمالِ حکمت پر دھبہ آئے گا اور اللہ تعالیٰ کی ذات پاک ہے۔ خُدا تعالیٰ سب پر قادر ہے اور قاہر ہے سب کو اپنی قدُرت اور احاطہ میں لینے والا ہے۔ وہ جو چاہے کرے اور جو کرے گا حکمت کے تقاضے سے کرے گا۔ وہ کسی سے مقہور نہیں ہے۔ تو جو علم و ادراک نہ رکھتا ہو اُس سے علم کی بات پوچھنا حکمت کے تقاضے کے خلاف ہے۔ اور وہ بات جو

حکمت کے تقاضے کے خلاف ہو اللہ تعالیٰ سے منسوب کرنا حماقت ہے۔ پس یہ سوال اس سے کیا جا رہا ہے جو محل ادراک ہے اور علم رکھتا ہے۔

یہاں دو چیزیں ہیں، سائل اور مسئول عنہ

سائل کا سوال ہی اس بات کی دلیل ہے کہ یہ محل ادراک ہے یعنی ادراک والا ہے کیونکہ سوال کرنے والا حکمت کے تقاضوں سے دُور نہیں۔ وہ علیم وخبیر ہے اور اللہ تعالیٰ کا علیم وخبیر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ جس سے سوال فرما رہا ہے وہ علم اور ادراک والا ہے۔

اگر عُزیر علیہ السلام کو علم وادراک نہ ہوتا تو چاہیئے تھا کہ وہ خاموش ہو جاتے یا کہتے کہ میں تو مرنے کے بعد مٹی پتھر اور جماد ہو گیا تھا۔ میں تو جب بتاؤں کہ مجھے کچھ علم ہو۔ لیکن وہ کہتے ہیں کہ میرے مولا میں " یوماً اَوْ بَعْضَ یَوْم " یعنی ایک دن یا ایک دن کا کچھ حصّہ ٹھہرا تو پتہ چلا کہ وہ اپنے علم وادراک کا اعتراف کر رہے ہیں اور اس کے مطابق بیان کر رہے ہیں۔ پس اللہ تعالیٰ کا سوال " کَمْ لَبِثْتُ " (کتنی دیر ٹھہرے) حکمت کے مطابق ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر اُن کو کوئی علم نہ ہوتا تو وہ یہ بات نہ کہتے۔ یہ دونوں باتیں دلیل ہیں کہ وہ محلِ ادراک ہیں۔

اب یہاں ایک شبہ پیدا ہو گیا کہ جو بات واقع میں تھی وہی بتاتے۔ علم معلوم کے مطابق ہونا چاہیئے لیکن یہاں ان کا علم تو معلوم کے خلاف ہے اور جو علم معلوم کے خلاف ہو وہاں تو لاعلمی پیدا ہو گئی۔

دیکھئے لوگوں نے اس حقیقت کو نہ سمجھا۔ جتنی گفتگو میں نے کی ہے اس کا مفاد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت عُزیر علیہ السلام کو محلِ ادراک جان کر سوال کیا اور

انہوں نے اپنے علم و ادراک کو مان کر جواب دیا۔ یہ دونوں باتیں ذہن میں رکھ کر یہ بات سمجھیے :

اَب اس جگہ "یَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ یَوۡم" کی بنا پر شبہ یہ ہے کہ اگر واقعی ان کو علم تھا تو یو مًا کے بعد اَوۡ جو کہا اس سے تو شک معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا اُن کو شک تھا اور صحیح مدت کا علم نہیں تھا۔

میں کہتا ہوں کہ دیکھئے "اَوۡ کَالَّذِیۡ مَرَّ عَلٰی قَرۡیَۃٍ" میں بھی "اَوۡ" موجود ہے اور یہ اللہ کا کلام ہے۔ اب بتاؤ کیا یہاں بھی "اَوۡ" شک کے لیے متعین ہو گا؟ نہیں! میں عرض کرتا ہوں کہ اَوۡ ہمیشہ شک کے لیے نہیں آتا۔ یہاں "اَوۡ" تاخیر کے لیے ہے۔ یعنی "اَوۡ بَعۡضَ یَوۡم" سے مراد یوم تقرر نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ میں اتنی دیر ٹھہرا کہ جو مدت قلیلہ تھی۔ اب اے مخاطب! تجھ کو اختیار ہے کہ اس مدت قلیلہ کو ایک دن اندازہ کرے یا ایک دن سے کم اور یہ دونوں مدتِ قلیلہ ہیں۔ تو معنیٰ یہ ہوئے کہ اے مولا! میں تو مدتِ قلیلہ ٹھہرا ہوں۔ اب اس کا اندازہ تو "یَوۡمًا" سے لگا لے یا "اَوۡ بَعۡضَ یَوۡم" سے۔ معلوم ہوا کہ محض مدتِ قلیل مراد ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں کئی جگہ "اَوۡ" اس لحاظ سے استعمال کیا ہے کہ وہاں مخاطب کو اختیار دیا ہے کہ یہ بات ہے اب تو اس کو اس سے اندازہ کر لے یا اُس سے۔

اب آگے اللہ تعالیٰ نے فرمایا "بَلۡ لَّبِثۡتَ مِائَۃَ عَامٍ" (بلکہ تو ٹھہرا رہا ہے سو برس تک) اب پھر سوال پیدا ہو گیا کہ "بَل" تو ابطال کے آتا ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے "بَلۡ" کہہ کر عزیر علیہ السلام کے کلام کو باطل کر دیا اور اس سے یہ معلوم ہوا کہ وہ قلیل مدت باطل ہے اور طویل مدت "مِائَۃَ عَامٍ" یعنی سو برس

صحیح ہے۔ پس اگر "مِائَۃَ عَامٍ" صحیح ہے تو یَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ یَوۡم" غلط ہے اور حضرت عزیر علیہ السلام نے مدتِ قلیلہ کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ باطل ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اُن کا کلام واقع کے مطابق نہیں ہے۔ لہٰذا کذب ہوا۔ کیونکہ کلام کا واقع کے مطابق ہونا صدق ہے اور کلام کا واقع کے مطابق نہ ہونا کذب ہے۔

اب اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو اُن کا یہ قول باطل ہوا یعنی واقع کے مطابق نہ ہوا اور یہی کذب ہے اور حضرت عزیر علیہ السلام نے یہی کیا یعنی واقع کے مطابق نہ بتایا تو ان کا کلام سچا نہ رہا۔

لیکن نبی نہ تو قصداً جھوٹ بولتا ہے اور نہ بلا قصد جھوٹ بولتا ہے۔ لہٰذا صاف معلوم ہوا کہ آیت کے معنیٰ یہ نہیں ہیں۔ اگر یہ بات تسلیم کر لی جائے تو حضرت عزیر علیہ السلام کی طرف کذب منسوب ہو گیا اور نبی جھُوٹ بولتا نہیں۔ کیونکہ جو جھوٹا ہو وہ نبی ہو ہی نہیں سکتا۔ لہٰذا آیت کے معنی غلط کیے گئے ہیں۔

پس اصل بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ وہ ایک امر کو دو واقعوں کی صورت میں ظاہر کر دے۔ اگر حضرت عزیر علیہ السلام کی طرف جھوٹ کی نسبت کریں تو یہ غلط ہے کیونکہ نبی جھُوٹ نہیں بول سکتا اور اگر وہ جھُوٹے نہیں تو پھر (معاذ اللہ) خُدا تعالیٰ کا قول جھُوٹا ہو گا۔ یہ تو اور بھی زبردست مصیبت ہو گئی۔ تو معلوم ہوا دونوں قول جھُوٹ نہیں۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ اس بات پر قادر ہے کہ ایک امر کو دو واقعی صورتوں میں نمایاں کر دے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ مدت تو سو برس کی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس سو برس کی مدت کو عُزیر علیہ السلام کے لیے اتنا چھوٹا کر کے گزارا کہ اُن کے لیے وہ "یَوۡمًا اَوۡ بَعۡضَ یَوۡم"

ہو کر گزارا ۔ پس حضرت عُزیر علیہ السلام کا علم اس واقعہ کے مطابق ہے جو اُن پر گزرا اور اللہ جل جلالہٗ کا کلام اس واقعہ اور حقیقت کے مطابق ہے جو کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر گزارا ۔ لہذا اللہ تعالیٰ کا کلام بھی سچا ہے اور حضرت عُزیر علیہ السلام کا کلام بھی سچا ہے ۔ اس کی دلیل میں ایک واضح اور روشن بات یہ ہے کہ قیامت کا دن ۵۰ ہزار سال کا ہوگا مگر اہلِ ایمان صلحا و اولیاء اور شہدا کے لیے ایک وقت کی نماز سے بھی جلدی گزر جائے گا ۔ قیامت میں اگر صالحین سے دریافت کیا جائے گا کہ تم یہاں کتنا عرصہ ٹھہرے تو وہ اپنے تجربہ و مشاہدہ کے مطابق وقت کا اختصار بیان کریں گے اور اگر کفار و مشرکین سے دریافت کیا جائے تو وہ اپنا ماجرا بیان کریں گے اور ہر ایک اپنے قول اور دعویٰ میں سچا ہوگا ۔

اب بتائیے کہ جو اللہ پچاس ہزار برس کو ایک وقت کی نماز میں تبدیل کر سکتا ہے تو کیا وہ سو برس کے عرصہ کو ایک دن یا دن کے کچھ حصّے میں تبدیل نہیں کر سکتا ؟ پس اللہ تعالیٰ کا کلام اس اصل واقعہ کے مطابق ہے اور حضرت عزیر علیہ السلام کا کلام اُن کے علم کے مطابق ہے ۔

اب دُوسری مثال سُنیے ۔ قرآن مجید میں ارشادِ ربانی ہے ۔

"پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو سیر کرائی رات کے تھوڑے سے حصّہ میں" ۔ (پ ۱۵)

اب اندازہ لگائیے کہ وہ تھوڑا عرصہ کتنا ہے کہ جس میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک تشریف لے جاتے ہیں اور اسی عرصہ میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کرام علیہم السلام سے مصافحہ فرماتے ہیں ۔ اسی مسجدِ اقصیٰ میں تمام

انبیاء علیہم السلام کو نماز پڑھائی۔ پھر حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمانوں پر تشریف لے جانا، ابواب سے گزرنا وہاں انبیاء علیہم السلام سے ملاقات کرنا، بیت المعمور ملاحظہ فرمانا، سدرۃ المنتہیٰ پر جبرئیل علیہ السلام کا علیحدہ ہونا، پھر رفرف پر جلوہ گر ہونا، پھر دریائے نُور میں غوطہ زن ہونا اور پھر ظاہر ہونا، پھر اللہ تعالیٰ کے حجابات عظمت کو مشاہدہ فرماتے ہُوئے وہاں جانا جہاں نہ کوئی مکان ہے نہ زمان ہے۔ پھر عرش عظیم پر جلوہ گر ہونا عرش سے اُوپر جانا۔ اس کے بعد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ تعالیٰ کے قُربِ خاص سے مشرف ہونا اور دیدار فرمانا پھر نمازیں لینا ـــــ پھر نمازوں ـــــ کی تعداد کم کرانے کے لیے بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام تک جا کر اللہ تعالیٰ کے حضور جانا۔ اب آپ بتائیں کہ ان سب کاموں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے کتنا عرصہ تھا اور یہ کتنا وقت گزرا۔ پس حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تو سفر معراج کا یہ اتنا طویل عرصہ تھا کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اٹھارہ سال تک سیر فرماتے رہے لیکن دنیا کے لیے اتنا طویل تھا کہ جب تشریف لائے تو بستر گرم تھا، دروازے کی کُنڈی ہل رہی تھی اور وضو کا پانی چل رہا تھا۔ [1]

پس ثابت ہو گیا کہ خُدا تعالیٰ قادر ہے کہ ایک ہی وقت کو کسی کے لیے طویل کر دے اور کسی کے لیے کم کر دے۔ اسی طرح اوّلاً وہ واقع سو برس کا تھا لیکن حضرت عزیر علیہ السلام کے لیے وہ قلیل کر دیا گیا۔ معلوم ہو گیا کہ "بَل" کا ابطال اس واقعہ کے مطابق تھا جو کہ علمِ الٰہی میں تھا۔

---

[1] روح المعانی ص ۱۵

اَب مَیں اس ساری بحث کا فیصلہ قرآنِ کریم سے عرض کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اسی آیت میں آگے ارشاد فرمایا :-

فَانْظُرْ اِلٰى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ وَانْظُرْ اِلٰى حِمَارِكَ (پ۳)

ترجمہ :- اب (ذرا) دیکھ اپنے کھانے اور پینے (کے سامان) کی طرف یہ باسی نہیں ہوا اور دیکھ اپنے گدھے کو۔"

یعنی انگور اور انجیر کے رس کو دیکھئے کہ ویسا ہی ہے اس سے بُو تک نہیں آئی اور گدھے کے اعضا بکھر گئے اور ہڈیاں چمک رہی ہیں۔ (تفسیر ابن عباس رضی اللہ عنہ)

اَب دیکھئے اللہ تعالیٰ نے جب سَو برس کا عرصہ گزارا تو وہ سب کیلئے سو برس گزرنا چاہیئے تھا یعنی کھانے پینے کی چیزوں پر بھی اور حمار پر بھی سو برس گزرتے لیکن ہُوا کیا ؟ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے" ذرا اپنے کھانے اور پانی کو تو دیکھ کہ بالکل متغیر نہیں ہوئے۔ ان میں ذرا فرق نہ آیا۔ اَب غور کرو جو چیز جلد خراب ہو جانے والی تھی وہ بالکل نہ بدلی اور گدھا جو طاقت ور ہوتا ہے، اس کی تمام ہڈیاں منتشر پڑی ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اے عزیر علیہ السلام میں نے یہ سَو برس کا عرصہ تجھ پر" یومًا او بعض یوم" کر کے گزارا۔ جس طرح تیرے لیے یہ عرصہ تھوڑا کیا تیرے کھانے اور پینے کی چیزوں کے لیے بھی قلیل کر دیا تاکہ تیرے کھانے اور پینے کا تازہ ہونا تیرے" یومًا او بعض یوم" کی دلیل ہو جائے۔ پس تیرے دعویٰ کی دلیل تو یہ طعام اور انگوروں کا رس رکھا ہے۔ اب میرے دعویٰ کی دلیل یہ ہے کہ تو اپنے حمار یعنی گدھے کی طرف دیکھ، سو برس میں اس کا جو حال ہونا چاہیئے وہی

اس کا ہے۔ پس دونوں قول سچے ہیں۔

مَیں نے ایک ایک جُزء الگ الگ کر کے بیان کر دیا۔ اب کوئی کانٹا نہیں ڈال سکتا۔ یہ دھوکہ میرے ساتھ بھی لیّہ (ضلع مظفر گڑھ) کے مناظرہ میں پیش آیا۔ مَیں نے جواب اسی طرح جامعیت کے ساتھ بیان کر دیا۔ خُدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں کہ اس جواب کے بعد حاضرین و ناظرین پر صُمٌّ بُکْمٌ کا منظر طاری تھا۔

تو دوستو! جس کو صاحبِ قرآن سے نسبت نہیں اس کو قرآن سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ یہ قرآن کی حقیقتیں تب کھُلتی ہیں جب صاحبِ قرآن سے نسبت ہو۔

وما علینا الا البلاغ

نوٹ: یہ تقریر بروز پیر ۹ رمضان المبارک ۱۳۸۲ھ بمطابق ۴ فروری ۱۹۶۳ء کو مدرسہ انوار العلوم کچہری روڈ ملتان میں بسلسلہ درس قرآن کی گئی۔ جناب محمد مختار حسن صاحب مرحوم نے اسے مرتب کیا۔ مرحوم پاکستان کے مشہور خطاط ابن کلیم کے بڑے بھائی تھے۔